ڈاکٹر غزل یعقوب

ٹیچنگ ریسرچ ایسوسی ایٹ، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد

آداب معاشرت اور تہذیب نسواں کی مصنفین کی سماجی آگہی

Absrtact:

The women who wrote in the Tehzib i Niswan were well aware of the social conditions and time requirements of their era. They knew that if they were not familiar with the modern trends, the women here would be left behind from the women of other nations. And due to the ignorance and unconsciousness of these women, there was also the possibility of weakening their national and country development. He also trained the Indian teachers on the same basis to make them a conscious member of the society who can cope with the demands of the time and can also train their children in a better way. These authors introduced the women to their religious rights and duties. And also explained the importance of their important role as an individual in the society. While the rest of the class was affected by modernity, Indian women also had a deep impact and they abandoned religious teachings and Islamic traditions and adopted new trends. These writers stressed the importance of living according to the Islamic rules.

Key Word: Tehzib i Niswan, development, abandoned

کسی بھی ثقافت کے انسان کا تشخص اس کی روایات اور مذہبی عقائد سے جڑا ہوتا ہے۔ نو آبادیاتی ہندوستان میں رہنے والے افراد بھی اپنی جدا تہذیب، روایات اور مذہبی عقائد رکھتے تھے۔ یہاں مسلمان، ہندو اور انگریز قومیں آباد تھیں جنھوں نے ایک دوسرے سے بہت سی عادات و اطوار مستعار لیں جن میں سے بعض ان کی ثقافت کا مستقل حصہ بھی بنیں اور کچھ کو رد کر دیا گیا۔ رد و قبول کے اس سلسلے میں ایک نکتہ خصوصی توجہ کا متقاضی ہے۔ وہ یہ کہ ہمیشہ سے حاکم طبقے کی روایات، عادات اور طرز حیات کو زیادہ اہمیت ملی ہے۔ ہندوستانی تہذیب میں بھی ایسا ہی ہوا پہلے پہل جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو یہاں کی دیگر تہذیبوں کے اختلاط سے نئی ثقافت ابھر کر سامنے آئی لیکن نو آبادیاتی دور میں یہ تبدیلیاں بڑے پیمانے پر واقع ہوئیں اور مغربی تہذیب کے اچھے برے تمام اطوار و روایات کو اپنانے کی سعی کی گئی۔ یہ اس لیے بھی ہوا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریز ہندوستان پر حاکم بن کر آئے تھے

۔انھوں نے ہندوستانی تہذیب کو مسمار کرنے کے لیے ہر شعبہ زندگی میں اپنے گہرے نقش ثبت کیے اور ہندوستانی اقوام کے لیے انھیں قبول کرنا لازمی قرار دیا۔ اگر ہندوستانی قوم ایسا نہ کرتی تو دنیاوی دوڑ میں پیچھے رہ جانے کے ساتھ ساتھ اپنا وجود بھی کھو بیٹھتی۔ہندوستانی تہذیب کو مسمار کرنے کے لیے انگریزوں کی پالیسی کی وضاحت ذیل میں سطور میں ہوتی ہے:

> انگریزوں نے ہم پر دو سو سال حکومت کی اور اس طویل مدت میں ان کی کوششوں کا محور یہ تھا کہ مسلمان اپنی قومی حیثیت کو گم کر کے ان کے رنگ میں رنگے جائیں،ان کے رہن سہن، رسوم ورواج یہاں تک کہ سوچنے کے انداز بدل جائیں اور جب وہ جائیں تو کہنے کو تو ایک آزاد ملک چھوڑ جائیں لیکن اس کی آزادی بے معنی اور غلامی کے مصداق ہو۔اس مقصد کے لیے انھوں نے پورے نظام حکومت کو اس طرز پر ڈالا کہ مسلمان مجبور ہو کر ان کے رنگ میں رنگ جائیں۔۔۔[1]

دنیاوی ترقی کی دوڑ میں ہندوستانی مسلمان اور ہندو دونوں اقوام نے انگریزوں کی تجاویز پر عمل درآمد شروع کر دی۔ ابتدا میں ایسا کرنے والوں کو مزاحمت اور کڑی تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن مزاحمت کرنے والوں کی آواز زیادہ دیر تک سنائی نہ دی اور جلد ہی اسے جدیدیت اور معاشرتی ترقی کے شور میں دبا دیا گیا۔

ہندوستانی اقوام کو جدید رویوں کو پروان چڑھانے اور بحیثیت قوم دنیا کے نقشے پر قائم رکھنے کے لیے سر سید احمد خان اور ان کے رفقائے کار نے خصوصی خدمات سرانجام دیں اور انھیں ہی سب سے زیادہ تنقید کا سامنا کرنا پڑا ۔سر سید احمد خان کی تعلیمات پر کچھ رجعت پسند اور کٹر روایت پرست مسلمانوں نے کفر کے فتوے بھی دیے۔ لیکن وہ اپنے مقصد سے پیچھے نہ ہٹے بل کہ مخصوص دائرہ کار میں رہتے ہوئے اپنے مقصد پر کاربند رہے۔ سر سید اور ان کے رفقائے کار کی کوششوں سے ہی ہندوستانی قوم جدید رجحانات سے متعارف ہوئی اور قومی و ملکی فلاح کے لیے کوشاں ہوئی۔ ہر تہذیب میں اتنی گنجائش ضرور موجود ہوتی ہے کہ جدید فکر اور جدید رجحانات کو اپنے اندر سمو سکے ۔ہندوستانی تہذیب میں بھی یہ گنجائش موجود تھی اور اسی لیے یہاں کے لوگوں میں مغربی تہذیب جلدی رچ بس گئی۔ لیکن اس کا نقصان یہ ہوا کہ ان کی اپنی تہذیب اور اقدار کے رنگ ماند پڑنا شروع ہو گئے۔

تہذیب نسواں میں لکھنے والی خواتین اپنے عہد کے سماجی حالات اور وقتی تقاضوں سے بخوبی واقف تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ جدید رجحانات سے واقفیت نہ ہونے پر یہاں کی خواتین دیگر اقوام کی خواتین سے پیچھے رہ جائیں گی۔ اور ان خواتین کی لاعلمی اور بے شعوری سے ان کی قومی و ملکی ترقی کے کمزور پڑ جانے کا احتمال بھی تھا۔ انھوں نے

ہندوستانی مستورات کی تربیت بھی انہی نقوش پر کی کہ انھیں سماج کا ایک باشعور فرد بنایا جائے جو وقتی تقاضوں سے نبرد آزما ہوں اور اپنی اولادوں کی تربیت بھی بہتر طریقے سے کر سکیں۔ ان مصنفین نے ہندوستانی مستورات کو ان کے مذہبی حقوق و فرائض سے متعارف کروایا۔ اور بحیثیت فرد سماج میں ان کے اہم کردار کی اہمیت بھی بتائی۔ جدیدیت کی رو سے جہاں باقی کا طبقہ متاثر ہوا تھا ہندوستانی خواتین پر بھی ان کا گہرا اثر ہوا اور انھوں نے مذہبی تعلیمات اور اسلامی روایات کو پس پشت ڈال کر نئے رجحانات کو اپنایا۔ تہذیب نسواں کی مصنفین نے ان خواتین کے لیے اسلامی طرز زندگی کے مطابق زندگی گزارنے کی اہمیت پر زور دیا۔

تہذیب نسواں کی مصنفین نے اسلامی ثقافت کی بقا، ہندوستانی طرز معاشرت اور سماجی معاملات و مسائل کے حوالے سے خصوصی مضامین تحریر کیے۔ انھوں نے اس ضمن میں جن موضوعات پر قلم اٹھایا، ان میں لباس کے انتخاب، مغرب کی بے جا تقلید سے گریز، اخلاقیات، عادات اور اطوار کے سلسلے میں اسلامی روایات پاسداری، اقدار و روایات کا تحفظ و بقا، گفت و شنید کے آداب، سماجی میل ملاپ کے فوائد، اسراف اور نمود و نمائش سے گریز، قدامت پرستی کے نقصانات، توہم پرستی اور پردے کے مسائل پر اپنے نظریات کا بھرپور اظہار کیا۔ ان نظریات پر تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کے افکار کا جائزہ ذیل کی سطور میں لیا گیا ہے:

ا۔ لباس کا انتخاب:

لباس انسان کے ستر کو ڈھانپنے کے ساتھ ساتھ اس کی تہذیب و ثقافت اور اس کے تشخص کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔ کرہ ارض میں پائی جانے والی تمام تہذیبوں میں ان کی روایات اور رواج کے مطابق لباس کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ لباس کے انتخاب میں کسی خاص خطے کے مذہبی عقائد، ثقافتی روایات، رسوم و رواج اور جغرافیائی عوامل کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ ہندوستانی نظام میں بھی یہ انہی تمام اجزا کی نمائندگی کرتا ہے۔ تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے ہندوستان خواتین کو جہاں دیگر معاملات پر آگاہ کیا وہاں لباس کے انتخاب، موقع محل کے مطابق لباس کے چناؤ، اور قومی تشخص کو برقرار رکھنے کے حوالے سے بھی معلومات بہم پہنچائیں۔ اس ضمن میں تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کی سماجی آگہی کے حوالے سے ذیل کی سطور میں تفصیل بیان کی گئی ہیں۔

1.ا۔ قومی تشخص اور لباس کی اہمیت:

نو آبادیاتی ہندوستان میں ایک مخلوط تہذیب نے جنم لیا۔ ہندو مسلمان کئی صدیوں تک ساتھ رہے تو ان کی عادات واطوار، رکھ رکھاؤ، رسوم ورواج اور لباس پر بھی ایک دوسرے کے اثرات مرتب ہوئے۔ لاشعوری طور پر دونوں قوموں ایک دوسرے کے اطوار کو اپنایا اور برتنا شروع کر دیا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ ہندو مسلم چاہے کتنا ہی عرصہ ایک ساتھ کیوں نہ رہے ہوں اور ایک دوسرے کے کتنے اثرات ہی قبول نہ کیے ہوں بہر حال مذہب ایک ایسا معاملہ ہے۔ جہاں دونوں اقوام ایک دوسرے کے مدمقابل آ کھڑی ہوتی ہیں اور یہیں سے ان کے اختلافات جنم لیتے ہیں کیوں کہ ایک مذہب کے لیے جو چیزیں جائز اور حلال ہیں وہاں دوسرے مذہب میں اس کے الٹ معاملات ہیں۔ مخلوط تہذیب کے یہ اثرات ایک حد تک تو درست تھے لیکن بعض افراد نے حد سے تجاوز کیا اور مذہبی حوالے سے چیزوں کا رد و قبول شروع ہوا تو اس کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔ اسی حوالے سے ایک مسئلہ لباس کا تھا۔ مسلم اور ہندو خواتین نے ایک دوسرے سے متاثر ہو کر لباس میں بھی تبدیلیاں شروع کر دی۔ جس سے دونوں اقوام کا ذاتی تشخص مسخ ہونا شروع ہو گیا۔ لباس چوں کہ کسی بھی قوم کے تشخص کی علامت ہے اس لیے بہت سے لوگوں نے اس تبدیلی کو ناپسند کیا اور یہ باور کروایا کہ ایک دوسرے کے امتزاج سے اپنی انفرادیت کو مسخ نہ ہونے دیں نا صرف ہندو مسلم خواتین نے ایک دوسرے کے لباس کو اپنایا بل کہ ہندوستانی خواتین میں کچھ آزاد خیال خواتین نے انگریزوں کے لباس کو بھی اپنایا اور ایسی وضع اختیار کی کہ برطانوی خواتین کے رنگ میں ڈھلنے لگیں۔ تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے اس ضمن میں خواتین ہند کو یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ اپنا تشخص مسخ نہ ہونے دیں اور اپنی انفرادیت کو قائم رکھیں کیوں کہ جو اقوام اپنی انفرادیت کو قائم نہیں رکھ سکتیں وہ بہت جلد معدوم ہو جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں امتہ الرؤف بیگم کے نظریات کی عکاسی ذیل کی سطور میں ہوتی ہے:

> مسلمان ہندوستان میں ایک الگ تمدن لے کر آئے تھے۔ ان کا لباس اور رہنے سہنے کا طریقہ ہمیشہ دوسری قوموں سے جدا رہا ہے لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ہماری مسلمان بہنیں اس امتیاز کو مٹانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ جس زمانے میں دوسری اقوام میں یہ جذبہ موجزن ہے کہ وہ اپنی قومیت کو زندہ کریں۔ اور اپنے زمانہ عروج کے تمدن کو از سر نو قائم کریں۔ مسلمان اپنی قومیت کو فنا کرنے اور اپنے تمدن کا جنازہ اٹھانے کے واسطے تیار ہیں۔۔۔۔ آج کل دنیا کی تمام قومیں ترقی کے دور سے گزر رہی ہیں۔ ہر قوم اپنے تمدن کو زندہ کرنے کی فکر میں ہے۔ مسلمان خواتین کا فرض ہے کہ اپنے تمدن کو جو مسلمہ طور پر ممتاز درجہ رکھتا ہے زندہ کریں۔ اور قومیت کو سیلاب حوادث سے بچائیں۔[2]

فاطمہ بنتِ کے محمد حسین نے بھی لباس کو مذہبی تشخص کے لیے اہم قرار دیا۔ نوآبادیاتی ہندوستان میں ہندو، مسلمان اور عیسائی تین طرح کے مذہب اور اقوام اکٹھے بسر ان کر رہے تھے اور باہمی میل جول اور مفارقت کی وجہ سے کچھ مسائل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ ہر قوم کے افراد اپنا لباس اپنے مذہبی تقاضوں کے عین مطابق زیب تن کرے تاکہ تشخیص مشکل نہ ہو۔ یہ مسئلہ اس وقت پیش آتا جب کسی ایسی محفل میں جانا پڑتا جہاں آشنائی نہ ہو اور مختلف مذاہب کے لوگ ہوں ایسی صورت میں لباس ہی انسان کی تشخیص کرواتا ہے۔ فاطمہ بنت کے محمد اس بات کی اہمیت پر زور دیتی ہیں کہ ہمیں دیگر قوام کی ہر چیز کو جوں کا توں اپنانے کی بجائے اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ اپنا تشخص گم نہ ہو۔ بل کہ اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ ہماری اپنی انفرادیت قائم رہ سکے۔ مسز قاضی سید سناء الدین بھی اپنے مضمون "مسلم خواتین کا لباس"[3] میں قومی تشخص اور اسلامی روایات کی بقا کے لیے ایسے لباس کے انتخاب پر زور دیتی ہیں جس سے قومی و مذہبی تشخص مجروح نہ ہو اور مسلمانوں کی انفرادیت قائم رہے۔ ان کے مطابق مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی تمدنی خصوصیات کو مسخ نہ ہونے دیں۔ جمیلہ سید حسن نے اس ضمن میں اپنے نظریات "[4] نکھار کے لوازمات" میں پیش کیے۔

لباس کے انتخاب سے متعلق احتیاط کے حوالے سے فاطمہ بنت کے محمد حسین نے اپنے خیالات کا اظہار "ہمارا لباس"[5] میں مفصل انداز میں کیا ہے۔ اسی طرح سلطانہ فیضی نے اپنے مضمون "مشنری بیبیاں" میں اپنے تجربات کی روشنی میں لباس کے انتخاب میں کی جانے والی احتیاط کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے اس ضمن میں یہ باور کروانے کی سعی کی ہے کہ مخلوط تہذیب میں رہتے ہوئے مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنا تشخص برقرار رکھیں، اور اس امتیاز کو برقرار رکھنے میں لباس اہم کردار ادا کرتا ہے۔ انسان کے افکار و نظریات تو اس سے تکلم کے بعد عیاں ہوتے ہیں لیکن لباس اور ظاہری وضع قطع انسان کے ابتدائی تعارف اور تشخص کو واضح کرنے میں لباس کا ایک اہم کردار ہے۔ اسی لیے ضروری ہے کہ اپنی انفرادیت کی بقا کے لیے لباس کے انتخاب میں احتیاط برتیں تاکہ بطور مسلمان ہماری انفرادی پہچان قائم رہے۔[6]

نوآبادیاتی عہد میں چوں کہ انگریز خواتین بھی بیشتر ہندوستانی خواتین کی توجہ کا مرکز رہیں اور ان سے انھوں نے بہت کچھ اچھا سیکھا بھی لیکن ان خواتین نے مغرب کی اندھا دھن تقلید سے اجتناب کا درس دیا اور یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ ہم ہندوستانی خواتین اپنے رسوم و رواج اور مذہب و عقیدہ کی وجہ سے مغرب کی اندھا دھن تقلید کریں گے تو محض رسوا ہوں گے۔ ان کے تہذیب کی تمام تر چیزیں ہمارے لیے موزوں نہیں ہیں اس لیے اپنی حدود و قیود میں رہتے ہوئے کسی حد تک کی پیروی تو کی جا سکتی ہے لیکن جوں کا توں اس تہذیب و معاشرت

اور انداز کو اپنا لینا کسی طور مناسب نہیں ہے۔ "کسی قوم کی مخصوص ثقافت کا کسی دوسری قوم کی ثقافت میں گم ہو جانا، اس قوم کی موت کا اعلان ہے اس قوم کو خواہ دوسرے اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں، لیکن وہ نہ ہی کوئی حرکت کر سکتی ہے اور نہ ہی اسے اپنے وجود کا احساس ہوتا ہے۔"[7]

2۔ اقدار وروایات کا تحفظ:

اسلامی معاشرے کی بنیاد باہمی محبت، اخوت، مساوات، عزت و تکریم اور اخلاقیات پر استوار ہے۔ جس میں پیغمبران اور انبیا کرام کے ذریعے معاشرے کو بہتر بنانے کی تعلیمات بہم پہنچائی گئیں تا کہ معاشرہ بگاڑ کا شکار نہ ہو جائے۔ لیکن ہندوستان کی مخلوط تہذیب کے نتیجے میں اسلامی تعلیمات اور عقائد کی بنیادیں ہل کر رہ گئیں اور معاشرہ عدم توازن کا شکار ہو گیا۔ جب بیداری نسواں کی تحریک کا عروج ہوا تو خواتین کو ان کے بنیادی حقوق ملنا شروع ہو گئے لیکن کچھ ہی عرصے میں خواتین اس میں توازن برقرار نہ رکھ سکیں تو ان کی بہتری کے لیے ایسے مضامین لکھے گئے جن سے ان میں شعور پیدا ہوا اور وہ معاشرے کا ایک پر وقار فرد بن کر اپنی صلاحیتوں کا اظہار کر سکیں۔ بعض کم علم خواتین نے آزادی کو منفی سمت میں لیا اور ہر قسم کی آزادی اپنے لیے بہتر سمجھی جس میں لباس، رہن سہن اور رکھ رکھاؤ سبھی شامل ہیں۔ انہی خواتین کے لیے ایسے متعدد مضامین شائع کیے گئے تا کہ ان کی اصلاح کی جا سکے۔ اسی سلسلے میں خدیجۃ الکبریٰ کا مضمون "اصلاح معاشرت" خاص اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں خواتین کو نقصان سے بچانے کی سعی کی گئی ہے۔

> معاشرتی انقلاب میں سب سے زیادہ نقصان مسلمان خواتین کو پر تکلف لباس اور جدیدی زیورات سے پہنچ رہا ہے۔ نقصان سے میری مراد صرف مالی نقصان نہیں بل کہ اخلاقی تنزل مراد ہے۔ جس نے ہماری زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔۔۔۔[8]

ان مصنفین نے خواتین میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ محض لباس اور زیورات انسان کی توقیر میں اضافہ نہیں کرتے بل کہ اعلیٰ اقدار اور مثبت انداز نظر ہی انسان کی اصل میراث ہیں۔ انسان کی شخصیت کا اصل وقار اس کی بات چیت اور افکار سے ہوتا ہے۔ افکار کا رخ جس قدر مثبت ہو گا اس کی شخصیت اسی قدر نمایاں ہو گی۔

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے مستورات میں شعور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ دوسری تہذیب کی وہ چیزیں جن کی چمک نے ان کی آنکھوں کو خیرا کر دیا ہے محض ایک سراب ہیں۔ اور ان کے قبول

کرنے سے محض اسلامی اور سماجی اقدار کمزور پڑتی ہیں اس لیے چاہیے کہ کسی بھی عادت کو اپنانے سے پہلے اس کے اچھے برے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا جائے اور اگر اس میں کوئی بھلائی محسوس ہو تو ضرور اپنائیں ورنہ اپنی تہذیب کو مسخ کرنے اور اسلامی احکامات سے روگردانی کی مرتکب نہ ہوں۔ جمیلہ بیگم نے اس سلسلے میں مغربی خواتین کی پیروکار ان خواتین کو تنبیہ کی ہے جو محض تقلید اور فیشن کے شوق میں تمباکو نوشی شروع کر دیتی ہیں، جس کی اجازت ان کے اپنے مذہب میں نہیں ہے کیوں کہ نشہ یا کسی بھی ایسی بری عادت کی مذہب سراسر ممانعت کرتا ہے۔ جمیلہ بیگم کے مطابق:

> وہ خواتین جو محض فیشن یا صرف شوق کی وجہ سے تمباکو نوشی اختیار کر چکی ہیں۔ اپنی قوت ارادی سے کام لے کر اس بری عادت کو ترک کرنے کا تہیہ کر لیں۔ کیوں کہ یہ ان کی اپنی تندرستی اور ان کے بچوں کی صحت کے لیے سخت ضرر رساں ہے۔[9]

رضیہ دلشاد بیگم نے اپنے مضمون "آج کل کی فیشن پرستی"[10] میں ہندوستانی افراد کی انگریزی معاشرت کی تقلید کی مذمت کی ہے۔ ان کے مطابق ہندوستان کے زیادہ تر افراد انگریزی زبان، لباس اور مغرب طرز معاشرت کے اسیر اور دلدادہ ہیں اور اور اس کی تقلید بھی کر رہے ہیں۔ ان کے مطابق اس درجہ تقلید اپنی روایات کی بقا کے لیے ایک خطرہ ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا ضروری قرار دیا لیکن اس کی اندھا دھند تقلید پر اعتراض کیا کیوں کہ اس سے اپنی روایات دم توڑتی ہیں اور اپنا تشخص پائمال ہو جاتا ہے۔ ضرورت کے تحت کسی قوم کی ضروری چیزوں کو اپنانا غلط نہیں ہے لیکن اس حد تک اپنانا کہ اپنی انفرادیت قائم نہ رہے یہ غلط ہے۔

تہذیب نسواں میں ایسے مضامین بھی لکھے گئے جن کے ذریعے خواتین میں روایات کی بقا اور رسوم و رواج کی ضرورت کو سراہا گیا۔ جدید رویوں کی اسیری سے بہت سے ہندوستانی گھرانوں میں جدت پسندی کا شوق پیدا ہوا تو ایسی رسوم سے احتراز کیا گیا جو ان کی روایات اور تہذیب کی نمائندہ تھیں۔ ان مصنفین نے ان رسومات کو ترک کرنے کی ممانعت کی جو ان کی روایات کی بقا کی ضامن ہیں۔ زرینہ خاتون نے اسی ضمن میں اپنے افکار کی ترسیل "ترک رسوم"[11] میں کی۔ انھوں نے فرسودہ رسومات کو ترک کرنے کی تاکید ضرور کی لیکن اپنی روایات سے یکسر لا تعلق ہونے پر افسر گی کا اظہار بھی کیا۔ انھوں نے فرسودہ رسومات کی جگہ ایسی رسومات کے جاری کرنے کو ضروری قرار دیا جس سے دنیاوی نفع کے ساتھ ساتھ دینوی فائدہ بھی حاصل ہو۔

3۔ مغرب کی بے جا تقلید سے گریز:

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے روایات کی پاسداری کے ساتھ ساتھ غیر تہذیب کی اندھا دھند تقلید سے اجتناب کرنے کی تلقین کی۔ ان کے مطابق دوسری تہذیب کو جوں کا توں قبول نہیں کرنا چاہیے بل کہ ضروری چیزوں کو اپنانا اور غیر ضروری اور نقصان دہ کو رد کر دینا چاہیے۔ الفش بے فیلسی نے اپنے مضمون "تہذیب اور تنہائی" میں مغربی تہذیب اور رہن سہن کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ ان کے مطابق ہمیں مغربی اطوار کو جوں کا توں نہیں قبول کرنا چاہیے بل کہ ضروری ہے کہ ہم اپنے سماج سے ہم آہنگ ہونے والی اشیا اور اطوار کو ہی قبول کریں۔ انھوں نے اپنے مضمون میں قدیم ہندوستانی معاشرتی رویوں اور رکھ رکھاؤ سے جدید نو آبادیاتی طرز معاشرت کا تقابل کیا ہے اور ہندوستانی تہذیب کے اہم پہلوؤں کو اپنانے پر زور دیا ہے۔

ان مصنفین نے ان ہندوستانی خواتین کو ہدف تنقید بنایا جو مغربی خواتین کے زیر اثر آ کر اپنی روایات اور کلچر کو حقیر جاننے لگتی ہیں۔ م۔ خ بدایونی نے اپنے مضمون "پردہ کی عزت" میں ہندوستانی خواتین پر یہ حقیقت آشکار کرنا چاہی ہے کہ جن خواتین کی تقلید میں وہ اپنی روایات سے منحرف ہوتی ہیں وہ خواتین از خود ان کے فیشن اور کلچر کو پسند کرتی ہیں۔ یہاں انھوں نے ہندوستانی ذہنیت پر بھی تنقید کی ہے کہ یہاں کے لوگ باہر کی چکا چوند سے اس قدر متاثر ہو جاتے ہیں کہ انھیں اپنی تہذیب کی تمام تر خوبصورتی اور دلکشی اس کے مقابلے میں کم دکھنے لگتی ہے۔ اس کی مثال درج ذیل اقتباس سے ملتی ہے:

> نہایت افسوس ہے کہ بعض بہنیں یورپین لیڈیوں کی تقلید کے شوق میں اپنے پردے کو حقارت سے دیکھتی ہیں۔ میں یورپین لیڈیز سے ملتی رہتی ہوں۔ اور مجھے اکثر ان سے پردے کے متعلق گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ جہاں تک میں نے دیکھا ہے سمجھ دار یورپین بہنیں ہمارے پردے کو بہت عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔[12]

مغرب کی بے جا تقلید سے ہندوستانی معاشرہ عدم توازن کا شکار ہو گیا۔ ان کی پیروی میں ہندوستانی فرد اپنی روایات اور اخلاقیات سے منحرف ہو گیا اور وہاں کے کلچر کو اپنانے میں بڑائی سمجھی۔ جس سے اخلاقی اقدار زوال پذیر ہوئی اور فرد انتشار کا شکار ہو گیا۔ ان مصنفین نے ایسی معاشرتی برائیوں کو ختم کرنے کی کوشش کی جو فرد کو منتشر کر رہی تھیں۔ بیگم یار محمد خاں نے اپنے مضمون "بیجا انگریزی تقلید" میں ایسی ہی معاشرتی برائیوں کا تذکرہ کیا ہے جو مغرب کی تقلید سے ہمارے معاشرے میں در آئی ہیں اور ہماری سماجی ڈھانچے کو کمزور کر رہی ہیں۔[13]

سردار محمدی بیگم نے اپنے مضمون "معصوم بچوں کے حق پر ڈاکہ "[14] میں مغرب کے بے جا تقلید کی مخالفت کی۔ اس مضمون میں انھوں نے ان خواتین کی سوچ کو ہدفِ تنقید بنایا جو انگریزی خواتین کی پیروی میں اپنے بچوں کی نشو و نما اور تربیت کا خیال نہیں کرتیں اور اس ذمہ داری کو ایک بوجھ کی مانند دوسرے پر لادنے کی فکر میں ہیں۔ انھوں نے ان خواتین کو یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ کوئی بھی خدمت گزار ان کے بچے کی ویسی تربیت نہیں کر سکتا جیسے ایک ماں کرتی ہے۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ بچوں کی پرورش ایسے نقوش پر کی جائے کہ وہ سماج میں ایک بہتر فرد کے طور پر ابھریں اور آئندہ زندگی میں خود اعتمادی کے ساتھ اپنے معاملات و مسائل سے نبرد آزما ہو سکیں۔

زہرا بیگم نے بھی اسی ضمن میں ہندوستان کے لوگوں کی عادات و خصائل کو موضوع بنایا ہے۔ جو جدید تہذیب کے اثر کو اس حد تک قبول کر چکے ہیں کہ روایات سے کوسوں دور آن پہنچے ہیں۔ ان کے مطابق ہندوستان کی عوام نے نئی تہذیب کی اچھی باتیں نظر انداز کرتے ہوئے بری باتیں اختیار کر لی ہیں۔ تقلید کے دوران ان لوگوں کو یہ خیال بھی نہیں رہا کہ کن چیزوں کو اختیار کرنا درست ہے اور کن کو نہیں۔ اس کا اظہار ان کے مضمون "ہندوستانیوں کی بعض عادتیں "[15] میں کیا گیا ہے۔

امۃ الرؤف نے بھی اسی نظریے کے تحت اپنے افکار کی ترسیل کی۔ انھوں نے اس حوالے سے آگاہ کرنے کی کوشش کی کہ مسلمان اپنا ایک الگ تشخص اور منفرد تمدن لے کر آئے تھے۔ ان کا طرز معاشرت ہمیشہ دوسری اقوام سے منفرد رہا ہے لیکن جدیدیت کی لہر میں لپیٹ میں کچھ خواتین نے یہ فرق مٹانے کی کوشش کی۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنی قومیت کو زندہ رکھیں وہ اس سے گریزاں ہیں۔ کسی قوم کی بدقسمتی کے لیے یہ کافی ہوتا ہے کہ وہ غیر تہذیب کو اپنا سمجھے اور اپنی اپنی تہذیب سے بیگانہ ہو جائے۔ بعض افراد کی وجہ سے یہی حال اسلامی تہذیب کا ہوتا جا رہا ہے۔ جس سے اندیشہ ہے کہ ہماری صدیوں کی روایات برائے نام رہ جائیں گی اور ہم اپنا تشخص کھو بیٹھیں گے۔ اگر کسی دوسری تہذیب کی تقلید کرنی ہی ہے تو وہ تعمیری ہونی چاہیے نہ کہ اس سے اپنی روایات واقدار کی تخریب کر دی جائے۔ ان کے مطابق یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم بنا سوچے سمجھے نمود و نمائش اور ظاہری چکا چوند سے متاثر ہو کر ان کی تقلید شروع کر دیں اور اس کے اصل فکری رویوں کو بالائے طاق رکھ دیں۔

4۔ اخلاقیات، عادات واطوار کے سلسلے میں اسلامی روایات کی پاسداری:

اسلام ایک مکمل نظام زندگی واضح کرتا ہے جس میں تمام افراد کے حقوق و فرائض متعین کیے گئے ہیں تاکہ

کسی ایک فرد کی بھی دل شکنی و دل آزاری نہ ہو۔اسلام میں رشتے کے تقدس اور احترام کو مرکزی حیثیت حاصل ہے ۔ہندوستانی مستورات میں جب وقتی تقاضوں کے مطابق ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ اپنی روایات اور اخلاقیات سے بے بہرہ ہوگئی۔جو اسلامی معاشرت کا خاصا ہیں۔اسلام میں خاندانی نظام کو خاص اہمیت حاصل ہے اور اس نظام کو بہتر طریقے سے چلانے کے لیے اخوت، مساوات، محبت اور بھائی چارہ مسلم حقیقتیں ہیں۔دوسری طرف مغربی تہذیب کی ظاہری چکاچوند میں اس نظام کی کوئی حیثیت نہیں ہے بل کہ فرد ایک دوسرے سے بیگانہ اور اپنے دھن میں مگن ہے۔مغرب کے یہ اثرات ہندوستانی تہذیب پر بھی پڑے اور یہاں کے لوگوں میں بھی خاندانی نظام کے خلاف بغاوت پیدا ہوگئی۔اسی مسئلے کے پیش نظر تہذیب نسواں کی مصنفین نے انھیں اپنی اقدار و اخلاقیات یاد دلائی اور اسلام کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کی تلقین کی اس حوالے سے فاطمہ صغرا بیگم لکھتی ہیں کہ :

> مردوں اور عورتوں کی معاشرت جدا جدا نہیں ہے بل کہ ایک ہے۔اور دونوں سے وابستہ ہے۔آج کل جس قدر کمزوریاں پائی جاتی ہیں،ان سے نہ ایک بری نہ دوسرا امور دالزام۔ہر ایک خاندان عجیب تنازعات کا شکار نظر آتا ہے۔۔۔۔ہماری خود غرضی اور غفلت نے ہمیں برباد کردیا۔خود غرضی نہیں بل کہ یہ خود فراموشی ہے۔ہم اپنے آپ کو بھی بھول گئے۔دوسروں کے حقوق کا خیال رکھنا تو کیا معنی۔اخلاقی حالت اس قدر کمزور ہے کہ حسن سلوک کا نام نہیں رہا۔غیر تو غیر اپنوں میں نہیں بنتی ۔والدین سے اولاد بدگمان ہیں۔اولاد والدین سے کشیدہ ہے۔بیوی کے دل میں شوہر کی عظمت نہیں۔شوہر کے نزدیک بیوی کی خاک وقعت نہیں۔ساس کو بہو پر اعتراض ہے۔بہو ساس کی شاکی ہے۔نند کو بھاوج پر اعتماد نہیں۔بھاوج کو نند سے سروکار نہیں۔بھائی کو بہن سے تعلق نہیں۔بہن کو بھائی سے محبت نہیں۔غرض آج کل کی دنیا کا تو کچھ باوا آدم ہی نرالا ہے۔[16]

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے ہندوستانی مستورات کی اخلاقی کمزوریوں کو مد نظر رکھتے ہوئے انھیں تلقین کی کہ وہ خود پرستی اور خود پسندی جیسی بیماریوں میں مبتلا نہ ہوں۔بل کہ اپنے اچھے اخلاق سے معاملات زندگی کو بہتر بنائیں۔ان مصنفین نے خواتین کو اسلامی شعار کے مطابق اپنی زندگی گزارنے اور نیک عمل کرنے کی ترغیب دی۔انھوں نے خاص طور پر ان خواتین کو مخاطب کیا جو دوسری تہذیب کی خواتین سے میل جول کے بعد ان کی روایات اور طرزِ زندگی سے مرعوب ہو کر اسی سانچے میں ڈھلنا شروع ہوگئی تھی۔ بلقیس بانو نے اسی ضمن میں خواتین کو مخاطب کرتے ہوئے یہ تلقین کی کہ افراط و تفریط سے بچیں اور اسلامی

تعلیمات اور خاندانی روایات کو ترک نہ کریں۔ دوسری تہذیب سے کوئی اچھی چیز سیکھیں بھی تو خذ من زمانک ما صفا ودع الذی فیہ الکدر[17] کا خاص خیال رکھیں۔ یعنی زمانے کی اچھی چیزیں اپنالیں اور خراب چیزیں چھوڑ دیں اور تمام معاملات کو تقدیر کے حوالے کر دیں۔ انھوں نے غیر تہذیب کی چیزیوں کو من و عن قبول کرنے کی بجائے اپنی اسلامی روایات کو ترجیح دینے کی تلقین کی۔

و۔ انے بھی اپنے مضامین کے ذریعے خواتین کی اخلاقی تربیت کی کوشش کی۔ انھوں نے خواتین کو تاکید کی کہ وہ کسی دوسرے شخص کے ظاہری خد و خال، وضع قطع کے بارے میں قیاس آرائیاں نہ کریں بل کہ اسے بحیثیت انسان اپنی کسوٹی پر ہر کھیں اور یہ دیکھیں کہ وہ انسانیت کے کس درجے پر فائز ہے۔ ظاہر تو ایک سراب کی مانند ہے جو بعد ازاں غلط ثابت ہوتا ہے۔ ان خیالات کی عکاسی ان کے مضمون "ہنسیے نہیں"[18] میں موثر انداز میں کی گئی ہے ۔

آنسہ سروری مصطفی نے خواتین کی شخصیت کے وقار کی اہمیت کے حوالے سے اپنے نظریات "تیز مزاج لڑکیاں"[19] میں کی ان کے مطابق لڑکیوں کو چاہیے کہ وہ اپنی عادات، اطوار اور برتاؤ سے اپنی ذات کی بہتری کی کوشش کریں۔ اس ضمن میں انھوں نے عام انسان اور پڑھے لکھے باشعور انسان کے موازنے سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ انسان کے افعال و افکار اس کی شخصیت کا پرتو ہوتے ہیں۔ اس لیے اپنے عمل و فعل سے کوشش کرنی چاہیے کہ ان کی شخصیت کا وقار قائم رہے نہ یہ کہ عام ان پڑھ انسان کی طرح ہر معاملے میں ایسا برتاؤ کریں کہ ان کی قابلیت مشکوک ہو جائے۔

شاہزاد جہاں بیگم نے اپنے مضمون "چھچھورپن"[20] میں انسانی اخلاقیات، عادات و اطوار کے حوالے سے اپنے افکار پیش کیے۔ ان کے مطابق انسان کو اپنی عمر کے مطابق برتاؤ کرنا چاہیے۔ اگر اپنے مرتبے کے مطابق انسان میں صبر و استقلال، بردباری، ایمان داری، دیانتداری، سنجیدگی اور شائستگی جیسے اوصاف نہیں ہوں گے تو اسے کبھی وہ عزت و توقیر نہیں مل سکتی جو ضروری ہے۔ اس لیے اپنی شخصیت کو پر وقار بنانے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی عمر کی مناسبت سے افعال کرے تاکہ اسے مہذب فرد کی حیثیت سے مناسب توقیر حاصل ہو سکے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو چھچھورپن کو اس کی ذات سے منسوب کر کے بے وقعت کر دیا جائے گا۔

ا.4۔ گفت وشنید کے آداب:

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے ہندوستانی مستورات کو وقتی تقاضوں کے مطابق باشعور بنانے کی کوشش کی۔ جس میں بات چیت اور گفتگو کے طریقے پر بطور خاص توجہ دی گئی۔ انسان کی بول چال اس کی شخصیت کی عکاسی کرتی ہے اس لیے بات کرتے ہوئے خاص طور پر اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ ان کی شخصیت کا مثبت رخ سامنے آئے۔ اگر کوئی ایسی صورت حال در پیش آجائے جہاں کسی سے مخاطب ہونا اپنی ذات کے لیے کسی شرمندگی یا شرمساری کا باعث بن رہا ہو تو کوشش کرنی چاہیے وہاں گفتگو کا سلسلہ جاری نہ رکھا جائے۔ اس ضمن میں بنت شیخ فضل الٰہی یوں رقمطراز ہیں:

> ۔۔۔۔ ہمیں سچ بات کے ظاہر کرنے میں ذرا بھی تامل نہ کرنا چاہیے۔ بل کہ ہر ایک امر پر خوب غور کر کے جب اس کا حسن اور قبیح معلوم ہو جائے تو پھر نہ ان جاہل عورتوں کی طرح اناپ شناپ بکنا چاہیے۔ بل کہ جہاں جہاں ان کے دلائل غلط ہوں ان کو پکڑ کر نہایت نرمی سے ان کا جواب دینا چاہیے۔ اگر نہ سنیں اور ہنسی اڑائیں تو ان کے واہیات خیالات کا اظہار سننا ہی نہ چاہیے۔ اور فوراً ان سے علیحدہ ہو جانا بہتر ہے۔[21]

و۔ا بات چیت کے دوران محتاط رویہ رکھنے کے حق میں ہیں۔ ان کے مطابق سوچ سمجھ کر ناپ تول کر بولنے میں ہی انسان کی بھلائی پوشیدہ ہے۔ جو شخص جس قدر محتاط انداز میں بات چیت کرے گا وہ اسی قدر کامیاب رہے گا۔ بعض اوقات نا چاہتے ہوئے بھی انسان کسی کی دل آزاری کا سبب بن جاتا ہے لیکن اگر بات کو ناپ تول کر کیا جائے تو اس کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ آداب گفتگو کے حوالے سے انھوں نے اپنے خیالات یوں رقم کیے ہیں:

> جو بہنیں بات چیت میں محتاط ہوتی ہیں وہ اپنی ملنے جلنے والیوں میں بہت مقبول ہوتی ہیں۔ اور اگر کسی نئی جگہ جائیں تو بڑی جلدی ان کی ملاقات کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ صورت شکل اور ظاہری وضع قطع کے بعد دوسرا نمبر زبان ہی کا ہے۔ جس سے انسان کی نسبت کوئی رائے قائم کی جاتی ہے اور اکثر وہ صحیح بھی ہوتی ہے۔۔۔[22]

صالحہ خاتون اپنے مضمون "پل صراط"[23] میں شخصی رویوں کو موضوع بناتے ہوئے سماجی اصلاح کی کوشش کرتی ہیں یہاں اسلامی عقائد زیادہ واضح نظر آتے ہیں ان کے مطابق ہمیں کسی کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر تنقید کر کے اس کی زندگی مشکل نہیں کرنی چاہیے۔ بل کہ اسلامی اصول و ضوابط کے مطابق کسی دوسرے کے لیے حتی المقدور آسانیاں پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اسلام تو مذہب ہی محبت کا ہے اور اگر ہمارے قول سے کسی کی دل

آزاری ہو رہی ہے تو ہم اسلامی اصولوں سے انحراف کر رہے ہیں۔ان مضامین میں خواتین کو نرم لہجہ رکھنے کی بھی تلقین کی گئی۔اور ایسے الفاظ کے استعمال سے اجتناب کرنے کو کہا گیا جو کسی کی دل آزاری کا باعث بنیں۔چوں کہ روایتی گھروں میں سماجی زندگی سے متعلقہ تربیت نہیں کی جاتی،اس لیے تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے اس کمی کو پورا کرنے کی بھرپور کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب ہوئیں۔

> ۔۔۔ گرم مزاجی کی وجہ سے ہر گز کوئی کام ویسی خوبی کے ساتھ نہیں نکلتا جیسا خوش اخلاقی اور تحمل کے ساتھ نکلتا ہے۔بل کہ یوں کہنا چاہیے کہ گرم مزاجی کے سبب سے اکثر بنا ہوا کام بگڑ جاتا ہے۔اور دوسرے نقصان یہ ہوتا ہے کہ گرم مزاجی کے باعث ہمارے چال چلن میں ناشائستگی، بد تہذیبی اور درشتی پیدا ہو جاتی ہے۔۔۔[24]

م۔ن بیگم آداب گفتگو سے خواتین کو یوں متعارف کرواتے ہوئے لکھتی ہیں "انسان کو لازم ہے کہ بات سنجیدہ کہے اور جو کہے اس کو پہلے خوب سوچ لے حکیم سے لوگوں نے کہا کہ آپ ہیں تو بڑے حکیم اور دانشمند لیکن آپ میں یہ سخت عیب ہے کہ آپ بہت دیر میں بات کرتے ہیں کہ سننے والا گھبرا جاتا ہے۔انھوں نے جواب مدیا کہ غور اور فکر کرنا اس بارے میں کہ کیا کروں اور کیا کہوں۔اس شرمساری سے بہتر ہے کہ افسوس میں نے کیا کیا اور کیا کہا۔"اہلیہ سید احمد سبزواری اپنے مضمون "صاف بیانی" میں انہی افکار کا پرچار کرتی نظر آتی ہیں۔[25]

الف۔ ن بیگم نے اپنے مضمون "گفتگو کے آداب" میں آداب گفتگو کے حوالے سے خواتین کی تربیت کی کوشش کی۔انھوں نے آداب محفل کے ضمن میں جن باتوں کا خیال رکھنے کی تعلیم دی ان میں درج ذیل شامل ہیں:

1۔ جب کوئی دوسرا شخص مخاطب ہو یا خود کسی دوسرے کو مخاطب کریں تو خاموشی کے ساتھ بات سنیں۔اور جب تک بات ختم نہ ہو جائے درمیان میں نہ بولیں۔

2۔ اگر کئی بہنیں ایک مجلس میں بیٹھی ہوں تو مناسب ہے کہ ہر ایک کو بات کرنے کا موقع دیا جائے نہ یہ کہ ایک ہی بہن بولتی رہے اور باقی سن منہ دیکھا کریں۔

3۔ گفتگو مختصر ہو اور اس میں شیرینی ہونی چاہیے نہ اس قدر طویل کہ سننے والا اکتا جائے۔اور نہ ایسی مختصر کہ دوسرا بات ہی نہ سمجھ سکے۔

4۔ باتوں اور انداز میں اکھڑا پن نہیں ہونا چاہیے۔

5۔ گفتگو میں مختلف قسم کی باتیں ہونی چاہییں صرف اپنے ہی گھر اور عزیزوں کی تعریف نہ کی جائے۔ضروری ہے کہ باتیں ایسے اشخاص کے متعلق ہوں جن کو سننے والے اچھی طرح جانتے ہوں۔واقعات بھی اس قدر عام نہ ہوں کہ بار بار سننے سے کوفت ہو بل کہ کوئی نئی بات ہونی چاہیے۔

6۔ اپنی قابلیت جتانے کے لیے عمداً موٹے موٹے الفاظ کا استعمال نہیں کرنا چاہیے، بل کہ آسان اور شستہ زبان میں بات کرنی چاہیے۔بے موقع الفاظ کے استعمال سے بھی گریز کرنا چاہیے۔[26]

سلطانہ نے اپنے مضمون "اخلاقی اصلاح "[27] میں خواتین کی اخلاقی تربیت کی اہمیت پر زور دیا۔ جس میں گفت وشنید کے آداب، آداب نشست وبرخاست اور طرز بود وباش کو بطور خاص موضوع بنایا گیا ہے۔اسی طرح صغرا ہمایوں مرزا نے بھی خواتین کو آداب گفت وشنید کے حوالے سے تربیت دی۔اس کا اظہار ان کے مضمون "کم سخنی "[28] میں ہوتا ہے۔

بیگم ڈاکٹر ایوب خاں نے اپنے مضمون "نقص نکالنا"[29] میں اسی طرح کے ایک رویے کا ذکر کیا ہے کہ جب چند خواتین کو باہم مل بیٹھنے کا موقع میسر آتا ہے تو وہ کسی نہ کسی کی عیب جوئی میں مصروف ہو جاتی ہیں۔نہ صرف عیب جوئی بل کہ ظاہری وضع قطع اور شکل وصورت کے نقائص بھی بیان کرنے لگتی ہیں جو کہ سراسر غلط ہے ایسا کرنا کسی بھی سمجھ بوجھ رکھنے والے انسان کو زیب نہیں دیتا۔اس سے بات کرنے والی کی اپنی شخصیت چھوٹی لگنے لگتی ہے۔اس لیے خواتین کو چاہیے کہ وہ دوران گفتگو کاص احتیاط برتیں اور کسی کی شخصیت کو یا ظاہری وضع قطع کو ہدفِ تنقید نہ بنائیں۔

حجاب امتیاز علی کے مطابق مستورات کو چاہیے کہ کسی بھی محفل میں دوسرے شخص کو بات کرنے کا یکساں موقع فراہم کیا جائے ناصرف یہ بل کہ دورانِ گفتگو مختلف قسم کے موضوعات پر بات کی جانی چاہیے۔ان کے مطابق ہندوستان کی محفلوں میں عام طور پر گنتی کے چند موضوعات پر ہی بات کی جاتی ہے ۔جن میں بیماری، نوکروں کی شکایت، اپنی عدم فرصتی کا رونا، مہمانوں سے بیزاری کا اظہار جن سب کا مقصد اپنی مظلومیت کا اظہار ہوتا ہے۔خواتین کو چاہیے کہ جب کبھی باہم مل بیٹھنے کا موقع ملے تو محض گنے چنے موضوعات پر بات نہ کریں بل کہ مختلف موضوعات پر بات کرتے ہوئے ایک دوسرے کے نظریات جاننے اور ان سے استفادہ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔انھوں نے خواتین کو یہ باور کروانے کی کوشش بھی کی کہ اگر اپنی یا اپنے خاندان کی بیماری یا

پریشانی کا تذکرہ ناگزیر ہو تو اس کا تذکرہ مختصراً کر دینا مناسب ہے۔ کیونکہ اختصار کے ساتھ بیان سننے والے پر اکتاہٹ طاری نہیں ہونے دیتا اور سننے والا ہمدردی کے جذبات رکھتا ہے۔ اسی طرح مہمانوں اور گھریلو ذمہ داریوں اور مصروفیت کا تذکرہ بھی موزوں الفاظ میں کیا جانا چاہیے تاکہ سننے والا مرعوب ہو نہ یہ کہ بار بار کے بیان سے اسے الجھن محسوس ہونا شروع ہو جائے۔ اگر گھریلو مسائل کا ذکر کرنا ضروری ہو تو اسے ایسے الفاظ میں بیان کیا جائے کہ سننے والا اسے توجہ سے سن سکے نا یہ کہ وہ بد ظن ہو کر آئندہ ملاقات سے کترانے لگے۔ انھوں نے دورانِ ملاقات مظبت اور تعمیری پہلوؤں پر بات کرنے کو زیادہ بہتر قرار دیا۔ اس سے انسان کی شخصیت کا وقار بڑھتا ہے۔

5۔ سماجی میل ملاپ کے آداب اور فوائد:

نو آبادیاتی ہندوستان میں چوں کہ عورت کا چار دیواری میں رہنے کا تصور عام تھا اس لیے خواتین کا خواتین سے بھی باہمی میل جول پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ عورتیں ایک دوسرے سے ملنے سے بھی قاصر تھیں۔ حالاں کہ سماجی میل ملاپ انسان کی سوچ اور طبیعت پر مثبت اثر چھوڑتا ہے۔ نا صرف یہ بل کہ ایک دوسرے سے ملنے کے بعد انسان ایک دوسرے کی اچھی عادات و خصائل کو بھی برتنے کی کوشش کرتا ہے جس سے نا صرف انسان کی ذات بل کہ گھریلو اور معاشرتی زندگی پر بھی مثبت اثر پڑتا ہے۔ اسی لیے تہذیب نسواں کی بہت سی خواتین نے اس مسئلے کی سنجیدگی کو سمجھتے ہوئے ایسے مضامین تحریر کیے جو عورتوں کے لیے مفید ثابت ہو سکیں۔ اور ان کے افکار کو بہتر کر سکیں۔

نو آبادیاتی ہندوستان میں خواتین چوں کہ گھر گرہستی تک محدود تھی۔ باہر کی دنیا اور لوگوں سے میل ملاپ سے ان کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس لیے جب تہذب نسواں کا اجرا کیا گیا تو اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا کہ انھیں آداب گفتگو سکھائیں جائیں تاکہ جب وہ کسی سے ملیں تو ناگواری کا کوئی تاثر نہ پیدا ہونے پائے۔ تہذیب نسواں کی خاطر متعدد خواتین نے اس حوالے سے مضامین تحریر کیے۔ بنت فضل الرشید خاں اس حوالے حضرت موسیٰ سے ایک واقعہ یوں منسوب کرتی ہیں "برتن میں جو کچھ ہوتا ہے۔ وہی چھلکتا ہے۔ اس کے پاس سخت کلامی ہے۔ وہ اسی کو نکال رہا ہے۔ میرے پاس نرمی اور بردباری ہے میں وہی دکھا رہا ہوں۔ اسی ضمن میں شہزاد جہاں نے "زنانہ تفریح گاہیں"[30] کے عنوان سے اپنے خیالات قلم بند کیے۔ انھوں نے ہندوستانی خواتین کے لیے چار دیواری سے نکل کر تسخیر دنیا کرنا ضروری سمجھا۔ ان کے نزدیک ہندوستانی خواتین کی فرسودہ خیالی اور توہم پرستی کی ایک بڑی وجہ سماجی میل ملاپ کا نہ ہونا ہے۔ کیوں کہ کوئی بھی انسان اس وقت تک شعور حاصل نہیں کر سکتا جب

تک اسے مناسب مواقع فراہم نہ کیے جائیں۔شاہزاد جہاں بیگم کے نزدیک ہندوستانی عورتوں کو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق مہذب بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ایسی تفریح گاہوں کا اہتمام کیا جائے جہاں انھیں دوسری خواتین سے میل ملاپ کے مواقع فراہم ہوں تاکہ وہ جدید صورت حال سے متعارف ہوں اوران کی فکر کو ایک نئی سمت عطا ہو۔

محترمہ قرۃ العین نے بھی ایک ایسے ہی سماجی مسئلے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے شبہ کی بیماری میں مبتلا ان لوگوں پر تنقید کی ہے جنھیں ہر وقت ایسے وسوسے گھیرے رکھتے ہیں کہ دوسرے تمام افراد ان کے بارے میں کسی وہم میں مبتلا ہیں اوران کی برائی میں مشغول ہیں۔شبہ یا وہم انسان کی اپنی ذات کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔اس سے اس کی اپنی زندگی متاثر ہوتی ہے اوراس کی سوچ کبھی بھی مثبت نہیں رہتی۔اس طرح وہ دوسروں سے بدگمان ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے لیے مشکل کھڑی کیے رکھتا ہے۔انسانکو خود بھی دوسروں کے بارے میں اچھی رائے رکھنی چاہیے اور دوسروں کو بھی اپنی ذات سے فائدہ دینا چاہیے۔ان کے افکار کی وضاحت ان کے مضمون "شبہ" مصنفہ نے جہاں خواتین کے حقوق کی بات کی وہیں وہ انھیں ان کے بنیادی انسانی فرائض کی انجام دہی کی تلقین کرتی بھی نظر آتی ہیں۔انھوں نے معاشرتی مسائل کی ایک وجہ ناجائز طرف داری کو قرار دیا۔ان کے خیال میں جب کسی مسئلے کے محض ایک پہلو کو دیکھا جارہا ہو تو وہی درست نظر آتا ہے ایسا کرنا درست نہیں ہے۔بل کہ کسی بھی معاملے کو بہتر طور پر سلجھانے کے لیے ہر پہلو کا جائزہ لے کر معاملہ حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔اس طرح کسی ایک فریق کی حق تلفی بھی نہیں ہوتی اور معاملہ بھی بہتر طور پر حل ہو جاتا ہے۔ان افکار کی ترسیل ان کے مضمون "شبہ"[31] میں کی گئی ہے۔ان ک نزدیک شبہ ایک ایسی بیماری ہے جس کا علاج دنیا کے کسی حکیم کے پاس نہیں ہے۔اس لیے حتیٰ المقدور اس سے باز رہنا چاہیے۔

ب۔ج۔نے سماجی میل ملاپ کو شعور و آگہی میں اضافے کے لیے ضروری قرار دیا۔ان کے مطابق خواتین ہند کے لیے ایسے مراکز کا قیام عمل میں لانا ضروری ہے جہاں یک جا ہو کر وہ ضروری مسائل پر گفت وشنید اور تبادلہ خیال کر سکیں۔تبادلہ خیال سے نا صرف انسان کے افکار و نظریات میں وسعت پیدا ہوتی ہے بل کہ بہت سی پیچیدہ گتھیاں بھی سلجھ جاتی ہیں۔باہمی میل جول اور ایک دوسرے کے تجربات کی روشنی میں انسان اپنے حالات و معاملات کو سلجھانے کی قابلیت بھی حاصل کرلیتا ہے۔اس فکر کا اظہار ان کے مضمون "تبادلہ خیال"[32] میں کیا گیا۔

تہذیب نسواں کی مصنفین نے جہاں عورتوں کے سماجی میل ملاپ کی اہمیت اور افادیت اجاگر کرنے کی کوشش کی وہیں انھیں آداب معاشرت سکھانے کی سعی بھی کی۔ ان مصنفین نے اپنی تحریروں میں عورتوں کو میل ملاپ کے اطوار اور آداب سکھانے کے لیے ایسے مضامین لکھے جن سے ہندوستانی مستورات میں یہ شعور پیدا ہو سکے کہ میل ملاپ کے دوران کن معاملات کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ جس میں سب سے زیادہ اہمیت اس مسئلے کو دی گئی کہ اپنی ذات کی خوشی کی خاطر کسی دوسرے کے لیے مشکل کا باعث نہ بن جائیں۔ ان خواتین مصنفین نے کسی کسی کے گھر جانے سے پہلے اجازات لینے، قبل از روانگی اطلاع دینے، قیام کے دوران وقت اور دوسرے کی سہولت کا خیال رکھنے اور دورانِ ملاقات کسی ایسی بات کرنے سے ممانعت کی تلقین، جو دوسرے کی دل آزاری کا باعث بنے جیسے موضوعات پر بھی اپنے افکار کی ترسیل کی۔ اس حوالے سے اکبر بانو کا مختصر مضمون "دو قابل اصلاح باتیں"[33] خاص اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں انھوں نے خواتین کو آگاہ کرنے کی کوشش کی کہ کسی کے گھر جانے سے پہلے اسے اپنے آنے کی اطلاع لازمی دیں، تاکہ ان کی اچانک آمد گھر والوں کے لیے پریشانی کا باعث نہ بنے۔ ان کے مطابق میزبان سے چاہے جتنی بے تکلفی کیوں نہ ہو بنا اطلاع دیے اور اجازت طلب کیے کسی کے ہاں جانا مہمان کی توقیر میں کمی کا باعث بن جاتا ہے۔

متذکرہ بالا تمام عوامل کو مد نظر رکھا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کا سماجی ڈھانچہ اس قدر لچک دار تھا کہ ہر تہذیب، ثقافت اور سماج کے گروہ کی رسوم و رواج کا اثر ان پر واضح ہوا۔ یہ اثر اس حد تک پختہ تھا کہ بعد ازاں ان رسوم و رواج کو جو غیر سے مستعار لی گئی تھیں، انھیں اپنا سمجھ کر برتا جانے لگا۔ دوسری طرف یہ معاملہ بھی کھلتا ہے کہ ہندوستانی قوم ایک عرصہ تسلط میں رہنے کے بعد اپنی ریت رواج سے منحرف ہو گئی اور دوسروں کے رسوم و رواج کو دل سے اپنائے بیٹھی رہی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستانی قدیم تہذیب کے اپنے رنگ پھیکے پڑنے لگے اور غیر تہذیب کا رنگ نکھر کر سامنے آ گیا۔ اس سے ان کے تشخص کو بھی ٹھیس پہنچی اور اقدار بھی مجروح ہوئیں۔ ہندوستان میں ایک روشن خیال باشعور طبقہ ایسا بھی موجود تھا جنھوں نے ان مسائل کے حل کے لیے کوششیں کیں اور مستورات میں پائے جانے والے عام مسائل کی تلافی کے لیے حل تجویز کیا۔ ان کے مطابق اپنی روایات، رسوم و رواج، مذہبی عقائد سے جڑے رہنے میں ہی انسان کی اصل بھلائی پوشیدہ ہے۔ اگر کوئی قوم دنیا کے نقشے پر اپنا نام برقرار رکھنا چاہتی ہے تو اسے چاہیے کہ اپنی تہذیب و ثقافت اور رسوم و رواج کو کسی قیمت پر نہ چھوڑیں۔ دنیاوی تقاضوں اور وقتی ضرورتوں کے تحت ان میں ترمیم اور اضافے ضرور کریں لیکن اسے یکسر نظر انداز کر دینا ان کی سب سے بڑی شکست ہے۔

حوالہ جات

1۔ ادارہ مطبوعات،ہماری ثقافت(کراچی:اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان):ص۷،۸۔

2۔ امتہ الرؤف بیگم،"مسلم خواتین کا لباس"،مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد۳۴،نمبر۲۶،(۲۷جون ۱۹۳۱ء): ص۵۹۸،۶۰۱۔

3۔ مسز قاضی سید سناء الدین "مسلم خواتین کا لباس "،مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد34،نمبر،37(12 ستمبر ۱۹۳1ء):ص925تا927۔

4۔ جمیلہ سید حسن ،"سنگھار کے لوازمات"، مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد52،نمبر3(۱۵جنوری1949ء): ص64تا67۔

5۔ فاطمہ بنت کے محمد حسین صاحب بنگلوسٹی،"ہمارالباس"،مشمولہ تہذیب نسواں شمارہ۲۰(۱۹مئی ۱۹۲۸ء):ص۴۶۹ تا۴۷۲۔

6۔ سلطانہ فیضی،"،مشنری بیبیاں"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد34،نمبر،43(24اکتوبر۱۹۳1ء):ص1103تا 1106۔

7۔ ادارہ مطبوعات،ہماری ثقافت(کراچی:اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان):ص۵،۶۔

8۔ خدیجۃالکبریٰ،"اصلاح معاشرت"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۳۱،نمبر۱۰،(۱۰مارچ۱۹۲۸ء):ص۲۳۳تا ۲۳۵۔

9۔ جمیلہ بیگم،"عورتیں اور تمباکو نوشی"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۴(۲۹جولائی۱۹۳۹ء):ص۳۸۷۔

10۔ رضیہ دلشاد بیگم ،"آج کل کی فیشن پرستی "،مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد36،نمبر،19(13مئی ۱۹۳3ء): ص444تا446۔

11۔ زرینہ خاتون،"ترک رسوم "،مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد36،نمبر،28(15جولائی1933ء): ص696تا698

12۔ م۔ رخ بدایونی،"پردہ کی عزت"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۸،نمبر۳۷،(۱۶ستمبر۱۹۰۵ء):ص۳۸۸۔

13۔ بیگم یار محمد خاں"بیجاانگریزی تقلید"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد34،نمبر،40(3اکتوبر۱۹۳1ء):ص995تا 997۔

14۔ سردار محمدی بیگم،"معصوم بچوں کے حق پرڈاکہ "،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد34،نمبر20(16مئی ۱۹۳1ء): ص468تا470۔

15۔ زہرابیگم"ہندوستانیوں کی بعض عادتیں"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد34،نمبر21(23مئی۱۹۳1ء): ص 483تا485۔

16۔ فاطمہ صغرا بیگم،"ہماری معاشرت"، مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد۱۷، نمبر۴۷(۲۱نومبر ۱۹۱۴ء): ص۵۵۷،۵۵۸۔

17۔ بلقیس بانو،"لڑکیوں کا سینما دیکھنا"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد40، نمبر،26(26جون1937ء): ص589تا590۔

18۔ و۔ا،"ہنسیے نہیں"، مشمولہ نسواں، جلد34، نمبر،15(11اپریل1۹۳۱ء): ص349تا352۔

19۔ آنسہ سروری مصطفی،"تیز مزاج لڑکیاں "، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد34، نمبر،42(17اکتوبر 1۹۳۱ء): ص1044تا1045۔

20۔ شاہزاد جہاں بیگم، "چھچھورپن"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد35، نمبر،2(9جنوری1932ء): ص9تا12۔

21۔ بنت شیخ فضل الہی، "ہماری اخلاقی کمزوری"،تہذیب نسواں، جلد۱۷، نمبر۴۲(۱۷اکتوبر۱۹۱۴ء): ص۵۰۱۔

22۔ و۔ا، "آداب گفتگو"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۵، نمبر۲۲(۲۸مئی۱۹۳۲ء): ص۴۹۷۔

23۔ صالحہ خاتون، "پل صراط"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۳(۲۱جنوری۱۹۳۳ء): ص۶۸۔

24۔ ہمشیرہ فریدالدین احمد، "گرم مزاجی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۳۵(۲۸اگست۱۹۱۵ء): ص۴۲۱۔

25۔ م۔ن بیگم، "گفتگو"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر۴۳(۲۸اکتوبر۱۹۰۵ء): ص۴۶۳۔

26۔ الف۔ن بیگم،"گفتگو کے آداب"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد36، نمبر،47(25 نومبر1933ء): ص2034تا2036۔

27۔ سلطانہ، "اخلاقی اصلاح"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد34، نمبر،32(8اگست1۹۳۱ء): ص815تا 816۔

28۔ صغرا ہمایوں مرزا،"کم سخنی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد37، نمبر،1(6جنوری1934ء): ص23تا 25۔

29۔ بیگم ڈاکٹر ایوب خاں،"نقص نکالنا"، مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد37، نمبر،16(21اپریل4 ۱۹۳ ء): ص366تا368۔

30۔ شاہزاد جہاں بیگم ،"زنانہ تفریح گاہیں "، مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد34، نمبر،17(28مارچ1 ۱۹۳ء): ص 394تا395۔

31۔ قرۃالعین، "شبہ "، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد34، نمبر19(9مئی1۹۳۱ء): ص250تا252۔

32۔ ب۔ج، "تبادلہ خیال"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد34، نمبر،39(26ستمبر1۹۳۱ء): ص963تا965

33۔ "اکبر بانو،"دو قابل اصلاح باتیں"،مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد36، نمبر،25(24جون1933 ء): ص584

1.Idara Matbooaat, Hamari Saqafat, Karachi: islami Jamiyat Talaba Pakistan, P 7,8

2.Amatul Rauf Begum,”Muslim Khawateen ka libas”, Tehzeeb-i Niswan,Vol 34,num 26,27 june 1931.p895

3.Mrs Qazi syyed Sana uddin, “Muslim Khawateen ka libas”, Tehzeeb-i Niswan,Vol 34, Num 37, 12 September 1931,P925-927

4.Jameela Syyed Hassan , “Singhaar kay Lawazmaat”, Tehzeeb-i Niswan,Vol 52,Num3,15 January 1949,P64-67.

5.Fatima binte K Muhammad Hussain, “ Hamara Libas”, Tehzeeb-i Niswan,Vol20,19 May 1928,p 469-472

6.Sultana Faizi, “ Missionary Bibiyan”, Tehzeeb-i Niswan,Vol 34,Num 43,24 October 1931,p 1103-1106

7. .Idara Matbooaat, Hamari Saqafat, Karachi: islami Jamiyat Talaba Pakistan, P 6,7

8.Khadija tul Kubra, “Islah e Muashrat” , Tehzeeb-i Niswan,Vol31,Num 10 ,10 March 1928,p 223-235

9.Jameela Begum, “Auraten aur tambakoo noshi” , Tehzeeb-i Niswan,Vol 4,29 July 1939,p738.

10. Razzia Dilshad Begum, “Aaj aur kal ki Fashion parasti” , Tehzeeb-i Niswan,Vol36,Num 19, 13 May 1933,p444-446.

11.Zareena Khatoon, “Tark e Rasoom” , Tehzeeb-i Niswan,Vol 36,Num 28,15 July 1933,P696-698.

12. Meem- Khay Badayon, “Tark e Rasoom” , Tehzeeb-i Niswan,Vol8,Num 37, 16 September 1905,P388.

13.Begum Yaar Muhammad Kahn, “ bey ja Angraizi taqleed” , Tehzeeb-i Niswan,Vol 34, Num 40, 13 October 1931,P 995-997.

14. Sardar Muhammadi Begum , “ Masoom Bachon kay Haq py Daka “ , Tehzeeb-i Niswan,Vol 34, Num 20,12 May 1931,p 468-470.

15. Zahra Begum , “ Hindustanion ki baaz Aadatein” , Tehzeeb-i Niswan,Vol 34,Num 21,23 May 1931,P483-485.

16.Fatima Sughra Begum, “Hamari Muaashrat” , Tehzeeb-i Niswan,Vol 17,Num 47, 21 November 1914,P557-558.

17. Balqees Bano, “Larkiyon ka Cinema dekhna” , Tehzeeb-i Niswan,Vol40,Num26,26 June 1937,P589-590.
18. Wao- Alif,” Hansiye Nahi” , Tehzeeb-i Niswan,Vol 34,Num 15,11April 1931,P349-352.
19.Aansa Sarwari Mustufa, “taiz mizaj Larkiyan” , Tehzeeb-i Niswan,Vol34,Num42,17 October 1931,P1044-1045.
20.Shahzad jahan Begum, “ Chichorpan” , Tehzeeb-i Niswan,Vol 35,Num2,9 january 1932,P9-12.
21.Bint e Sheikh Fazal Elahi, “Hamari Ikhlaqi Kamzori”, Tehzeeb-i Niswan,Vol17,Num 42,17 October 1914,P 501.
22.Wao -Alif, “Adaab e guftagoo” , Tehzeeb-i Niswan,Vol 35,Num 22,28 May 1932,P497.
23. Saleha Khatoon, “Pul e Siraat” , Tehzeeb-i Niswan,Vol36,Num3,21 January 1933,P68.
24. Hamsheera Farid ud din Ahmed, “Garam Mizaji” , Tehzeeb-i Niswan,Vol18,Num 35,28 August 1915,P421.
25. Meem –Noon Begum, “ Guftagoo” , Tehzeeb-i Niswan,Vol8,Num43,28 October 1905,P463.
26. Alif-noon Begum, “ Guftagoo kay Adaab” , Tehzeeb-i Niswan,Vol36,Num47,25 November 1933,P2034-2036.
27.Sultana, “Ikhlaaqi Islah” , Tehzeeb-i Niswan,Vol 34,Num32,8 August 1931, P815-816.
28. Sughra Hammayun Mirza, “kam Sukhani” , Tehzeeb-i Niswan,Vol37,Num 1, 6 January 1934,P23-25.
29. Begum Dr Ayyub Khan , “ Nuqs Nikalna” , Tehzeeb-i Niswan,Vol37,Num 16,21 April 1934,P366-368.
30. Shahzad Jahan Begum, “zanana tafreeh gahein” , Tehzeeb-i Niswan,Vol34,Num17,28 March 1931,P394-395.
31. Qurat ul Ain , “Shubha” , Tehzeeb-i Niswan,Vol34, Num 19, 9 may 1931,P 250-252.

32. Bey-Jeem , ‘tabadla e Khayal” , Tehzeeb-i Niswan,Vol 34, Num39,26 September 1931,P963-965.

33.Akbar Bano, “Dou Qabil e Islah Batein” , Tehzeeb-i Niswan,Vol36,Num 25,24 June 1933,P 584.